© rasailojaraid.com

سراج منیر

مطالعۂ تہذیب کے منہاج

ایک تنقیدی جائزہ

فی زمانہ انسانی صورتِ حال کے مطالعوں میں تہذیب و ثقافت کی اصطلاح کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس منظر کی اتنی متنوع اور مختلف تعبیریں اور تعریفیں کی گئی ہیں کہ اس اصطلاح کا اطلاق بہت مبہم ہو کر رہ گیا ہے۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ لوگوں نے محض اس اصطلاح کی تعریف متعین کرنے کی کوشش میں کتابوں کی کتابیں لکھ ڈالی ہیں لیکن یہ ابہام رفع نہیں ہوتا۔ اس کا ایک ممکن سبب تو یہی ہو سکتا ہے کہ یہ اصطلاح ایک ایسے وسیع نظام پر منطبق ہوتی ہے جو کم و بیش پورے انسانی عمل اور تاریخ میں اس سے پیدا ہونے والے نتائج کو حاوی ہے اور اس کے دائرے میں مذہب، فنونِ لطیفہ، معاشرت، تاریخ، فلسفہ اور بشریات تک سب کے سب کسی نہ کسی درجے میں شامل ہیں۔ جب میدانِ مطالعہ اس قدر وسیع ہو تو تدریج یا مرکزیت کے کسی تصور کی غیر موجودگی سے اس طرح کا ابہام پیدا ہونا لازم ہے۔ یہ ابہام تہذیب کے کسی آفاقی اور متفق علیہ تصور کے قیام میں حائل ہے اور اس طرح کے کسی تصور کی غیر موجودگی میں کیے جانے والے مطالعے اپنے منہاج اور نتائج، ہر دو اعتبار سے محلِ نظر ہیں۔

اب تک مطالعۂ تہذیب کا مروجہ منہاج یہ ہے کہ انسانی عمل، بلکہ انسان اور خارجی دنیا کے تعامل سے پیدا ہونے والے کچھ مظاہر کو تہذیبی قرار دے کر ان کا تجزیہ کیا جاتا ہے، یا ان کے باہمی تعلق کی نوعیت کو پیشِ نظر رکھ کر اصولِ ثبات و تغیر یا معیار وضع کیے جاتے ہیں اور اس طرح اس غیر مرئی اور مجرد تصور تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جسے بعض علما نے روحِ تہذیب کا نام دیا ہے۔ اس ضمن میں کارل مین ہائم نے یہی اصول بیان کیا ہے اور اس سلسلے میں درپیش مشکلات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

"اہم اور بنیادی سوال یہ ہے کہ وہ کلیت جسے ہم روحِ عصر یا تناظرِ عالم (WELTAN SCHUUANG) قرار دیتے ہیں، کسی عہد کے متنوع مظاہر سے کس طرح منتزع ہو سکتی ہے اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہم کیوں کر اسے نظری طور پہ بیان کر سکتے ہیں "۔

تہذیبی مطالعوں کی تاریخ میں یہ سوال اب تک حل طلب اور تشنۂ جواب ہے۔ اس کے پیچھے اصل سوال یہ ہے کہ کیا ادراک حسی کی کلیت، کسی شے کے مجرد تصور، عین یا اصلِ حقیقت کے برابر ہوتی ہے۔ یہ درست ہے کہ بعض مکاتبِ فکر کے نزدیک اس سوال کا جواب اثبات میں ہے لیکن ان کے نزدیک بھی مسئلہ حل نہیں ہوتا بلکہ ایک نئی پیچیدگی اختیار کر لیتا ہے یعنی یہ کہ حسی ادراکات کا مجموعہ معروضی ثبوت رکھتا ہے لیکن اس میں وہ آفاقیت نہیں ہے جو کسی تصور کو معیار کی شکل دیتی ہے اور معیار کی غیر موجودگی میں کیا جانے والا مطالعہ ماہیت کا جزوی علم تو دے سکتا ہے، روحِ تہذیب کی حرکتِ غائی اور اس کے سمتِ سفر کے بارے میں درست نتائج تک ہماری رہنمائی نہیں کر سکتا۔ اس مسئلے کا جو حل تجویز کیا گیا ہے وہیں سے سارے اختلافات اور ابہام پیدا ہوتے ہیں۔ حل یہ ہے کہ ماہیت کے جزوی علم کو معیار قرار دے کر اس کے ذریعے فیصلے کیے جائیں اور حسی منہاج کو سختی کے ساتھ برت کر شماریاتی بنیادوں پر آفاقی معیار ترتیب دیے جائیں۔ یہ طریقۂ کار چونکہ ایک علمیاتی غلطی کا مرتکب ہوتا ہے اس لیے درست نتائج تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس نقطۂ نظر کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ یہاں ادراک کرنے والی موضوعیت کے ان تصرفات سے صرفِ نظر کر لیا جاتا ہے جو وہ اپنے ادراکات سے اصول کا انتزاع کرنے کے ضمن میں کرتی ہے۔ اس طرح خالص معروضیت، حتمی اور فیصلہ کن نقطے پر آ کر خالص موضوعیت میں بدل جاتی ہے اور معروض و موضوع کا مخمصہ جو علمیات کا بنیادی مسئلہ ہے، حل نہیں ہو سکتا۔

مظاہرِ تہذیب کے مطالعے سے کلیتِ تہذیب تک پہنچنے میں جو مشکلات حائل رہی ہیں، ان کا سب سے پہلے شعور DILTHEY نے کیا۔ مطالعاتِ تہذیب کے منہاج کو مغربی تاریخِ فکر میں اس نے کچھ اس انداز سے طے کر دیا کہ آج تک سماجیاتِ تہذیب کا مطالعہ کرنے والے اس کے طے کردہ سانچوں کی گرفت سے نہیں نکل سکے۔ تہذیب کے مظاہر کی کثرت میں ایک ہم آہنگی کی تلاش اور اس ہم آہنگی کی منطقی تقسیم کے مسئلے نے اسے اس امر پہ مجبور کیا کہ وہ علومِ انسانی میں سے کسی ایک کو بنیادی سانچہ قرار دے اور اس کی تشکیلات کے دروبست میں تہذیب کے مختلف مظاہر کی وحدت کو پرو دے۔ چنانچہ اس نے اس مطالعے کے تین بنیادی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سانچے قرار دیے ہیں اور ان کے تحت مظاہر کو تین انواع میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ فطرتیت سے مرتب ہونے والے نظام

۲۔ معروضی عینیت سے ترتیب پانے والے سانچے

۳۔ موضوعی عینیت سے متشکل ہونے والی صورتیں

ان تینوں اقسام سے اس نے تہذیب کے جن مظاہر کو ترتیب دے کر حیاتی ڈھانچے بنائے ہیں ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں ایسی میکانیکیت پیدا ہو گئی ہے جو انسانی فطرت کے منافی ہے۔ کائناتی قوانین کی دریافت کی یہ کوشش یہیں تمام نہیں ہوتی بلکہ آگے چل کر DILTHEY کے مکتبِ فکر سے ہی متعلق NOHL نے ان تینوں قسموں کو بصری مظاہر کی دنیا پر منطبق کر دیا۔ کلیتہً نظری طور پر ترتیب دیتے ہوئے مقدمات کا اطلاق جب بصری مظاہر کے تنوع پر ہوا تو اس سے تہذیب کی انسانی اور تاریخی مظہریات میں لازمانی اور لامکانی اوضاع وجود میں آئے جو ایک میکانیکی تسلسل میں ایک دوسرے کے قبل و بعد ظاہر ہوتے ہیں۔ یہاں سے مطالعاتِ تہذیب نے ایک اہم موڑ کاٹا اور آرٹ کے مظاہر کو تہذیب کے معیاری اوضاع قرار دے کر ان کے ذریعے روحِ تہذیب کو سمجھنے کی کوشش شروع ہوئی۔ اس نقطۂ نظر سے پیدا ہونے والا معرکۃ الآرا کام ALOIS RIEGL کی تصنیف تھا جس نے اس صدی کے آغاز (۱۹۰۱ء) میں ART MOTIVE کو بنیاد بنا کر تہذیب کے قوانینِ حرکت اور تشکیلِ اوضاع کے اصول اقلیدسی مہارت کے ساتھ مدوّن کیے۔ یہاں تفصیلات کا بیان مقصود نہیں، دیکھنا صرف یہ ہے کہ موجودہ مطالعاتِ تہذیب کا جو منہاج طے پایا ہے اس کے پس منظر میں کیا رجحانات کارفرما ہیں اور ان کے طریقۂ کار کا اصولی جواز کہاں سے مہیا ہوتا ہے۔ نیز یہ کہ تاریخ فکر میں ایک رجحان کی نمو کن سمتوں میں ہوتی ہے۔ بہرکیف عہدِ جدید میں مطالعاتِ تہذیب کا اہم ترین ستون SPENGLER بنیادی طور پر RIEGL کے کام سے ہی متاثر تھا اور اس نے تہذیب پر اپنے اصول اسی کی پیروی پر ترتیب دیے ہیں۔ بعد میں آنے والوں میں سے اکثر اہم نام چاہے TOYNBEE ہوں یا SOROKIN وہ کم و بیش اسی سانچے پر اپنی بنیاد رکھ کر آگے بڑھتے ہیں۔ یہ رجحان آگے بڑھ کر بشریات کے مطالعوں کی بنیاد میں راسخ ہوا اور فی زمانہ اس کی تازہ ترین نمائندگی اس مکتبِ فکر سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوتی ہے جو اپنے طریقۂ کار کو آثاریاتِ علم ARCHEOLOGY OF KNOWLEDGE کا منہاج قرار دیتا ہے۔ اس طریقۂ کار کے تحت تمام مظاہرِ تہذیب کے بنیادی سانچوں کو مشخص کر کے قانونِ مماثلت کے ذریعے وسیع تر تشکیلات میں سمویا جاتا ہے۔ لیکن مسئلہ اب تک حل طلب ہے۔ یہاں بھی انسانی شعور اور اس کا اختیاری عمل اپنی آزادی سے محروم ہو کر تہذیبی سانچوں کی کٹھ پتلی بن جاتا ہے اور انسانی موضوعیت کا تخلیقی عمل میکانیکی خارجی تعامل سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

یہ رجحانات جن کی علمیاتی بنیادوں کا ایک اجمالی ذکر اوپر ہوا ہے، تہذیبی حرکت کے کائناتی قانون کی تلاش میں عروج و زوال کا ایک تصور قائم کرتے ہیں اور یہاں سے مسئلے میں ایک بڑا الجھاؤ پیدا ہوتا ہے۔ ماہیتِ تہذیب اور اس کے عناصر عروج و زوال کا جو تصور کسی ایک لمحۂ زمان یا علاقے میں موجود ہوتا ہے، اسی کو ایک آفاقی اور معیاری تصور قرار دینے کی کوشش نے بڑے پیمانے پر خلط مبحث پیدا کیا ہے۔ اس منہاج کی غلطی پر خود SPENGLER نے گرفت کی ہے اور اس کے پیچھے کارفرما ذہنیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"مغربی یورپ کی سرزمین ایک مستقل قطب اور مرکز سمجھی جاتی ہے ۔ زمین کا وہ یکتا اور یگانہ ٹکڑا جسے محض اس امر کی وجہ سے دوسروں پر تفوق حاصل ہے کہ ہم یہاں قیام پذیر ہیں، لاکھوں برسوں پر محیط تاریخوں اور پُرشوکت دور افتادہ تہذیبوں کو (اس مرکز کے گرد) گردش کناں دکھایا جاتا ہے۔ یہ گویا ایک نظامِ شمسی ہے۔ ہم زمین کا ایک حقیر ٹکڑا تاریخی نظام کے فطری مرکز کے طور پر چن لیتے ہیں اور اسے مرکز میں قائم سورج بنا دیتے ہیں۔ اسی سے تمام تاریخی واقعات پر حقیقی روشنی پڑتی ہے، ان کی اصل اہمیت ایک "تناظر" میں طے ہوتی ہے۔ سپنگلر اسے مطالعۂ تہذیب کا "بطلیموسی طریقۂ کار" قرار دیتا ہے۔

یہاں تک ہم نے مطالعۂ تہذیب کے اس منہاج کا ذکر کیا ہے جس کی بنیاد میں موجود علمیاتی خرابیاں اسے اس قابل نہیں رہنے دیتیں کہ وہ خود یورپی تہذیب کی باطنیت کو سمجھ سکے۔ یہ پیچیدگی اس وقت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے جب اس طریقۂ کار کا اطلاق ان تہذیبوں پر کیا جاتا ہے جن کی ساخت یورپی ذہن کے لیے اجنبی ہے۔ عہدِ جدید میں اسلامی تہذیب کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو مطالعے یورپ میں کیے گئے ان کا غالب حصّہ اسی منہاج کے اطلاق سے پیدا ہوتا ہے۔ اس اصول کو تسلیم کرنے کے بعد کہ ہر تہذیبی دائرے میں حقیقت کا ایک تصوّر موجود ہوتا ہے۔ اور تہذیبی عمل انسانی دنیا میں حقیقت اور انسان کے اسی تصوّر کو واقعی شکل دینے کی ایک صورت ہے، یہ لازم ہو جاتا ہے کہ تہذیبی مطالعوں میں حقیقت کے اس تصوّر کو پیشِ نظر رکھا جائے اور اس کے نصب العین کی روشنی میں مظاہرِ تہذیب کی قدر و قیمت متعین کی جائے۔
اسلامی تہذیب کے جو مطالعے یورپ یا اس کے زیرِ اثر ہماری اپنی جامعات میں ہوئے ان کا طریقۂ کار یہ ہے کہ مظاہرِ تہذیب کے مجموعے کی ایک آفاقی وحدت اور قدر تسلیم کر کے اس کے زیرِ اثر تہذیب کی مجموعی قدر پر ایک حکم لگایا جاتا ہے اور اس کی بنیاد میں روزِ اوّل سے یہ غلط فہمی موجود ہے کہ اسلام نے ادب اور فضائلِ اخلاق کا تصوّر جاہلیت سے، فقہ یہودیت سے، کلام و فلسفہ یونان سے، قانون رومیوں سے، فنِ تعمیر بازنطینیوں سے، تصوّف عیسائیوں سے مستعار لے کر اپنا نظام ترتیب دیا۔ یہ امر کہ دنیا کی کوئی تہذیب عدمِ محض سے وجود میں نہیں آتی، اس امر کا جواز قرار پایا کہ دنیا کی ہر تہذیب اپنے سے پیشتر کی تہذیبوں کی قائم مقام ہوتی ہے۔ یہ وہ غلط فہمی ہے جس نے تہذیبی مطالعے کے پورے منہاج کو پراگندہ کیا اور تصوّرِ حقیقت کی کارفرمائی کو، جو تہذیب کی بنیاد ہے، پس منظر میں پھینک دیا ہے۔

مغرب میں اسلامی تہذیب کے مطالعے کم و بیش چار نقطہ ہائے نظر سے کیے گئے ہیں جن سے چار گروہ پیدا ہوئے ہیں:

(۱) ماہرینِ فلسفۂ تاریخ جو عالمی تہذیب کا جائزہ لیتے ہیں اور اس ضمن میں اسلام اور اس کے تہذیبی منظر نامے کا مطالعہ کرتے ہیں۔

(۲) وہ مستشرقین جو بطورِ خاص اسلامی تہذیب کے مظاہر کا مطالعہ کرتے ہیں۔

(۳) تاریخ فلسفہ و علوم پر لکھنے والے جو فلسفہ و تاریخ کی عالمی حرکت میں، مغرب کے نقطۂ نظر سے اسلامی تہذیب کے اس پہلو کو مطالعے کا موضوع بناتے ہیں۔

(۴) ماضی قریب میں پیدا ہونے والا وہ گروہ جو اسلامی دنیا کے موجود ڈھانچے کو سیاسی اور معاشی پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسلامی دنیا میں ان موضوعات پر لکھنے والے دو گروہوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ ایک وہ جو کسی نہ کسی طور ان میں سے کسی ایک کے زیرِ اثر ہے۔ اور دوسرا وہ جو عصرِ حاضر کے علمیاتی چیلنج کی روشنی میں اسلامی تہذیب کے مطالعے کی وہ منہاج دریافت کرنا چاہتا ہے جس سے اس کی قوتِ محرکہ کا اندازہ ہو سکے اور اس کی تاریخ کے موثرات پر نتیجہ خیز گرفت حاصل کی جا سکے۔

مندرجہ بالا تمام گروہوں کے رجحانات کے مختصر جائزے سے صورتِ حال واضح ہو سکے گی:

۱۔ فلسفۂ تاریخ پر لکھنے والوں میں سے اکثر نے اسلامی تہذیب کو اپنے نظامِ فکر میں ایک جگہ دی ہے۔ ۱۹ویں صدی کے ابتدائی حصے تک اس قبیل کے مطالعوں میں اسلام کی اہمیت نسبتاً کم تھی، چنانچہ ۱۹ویں صدی کے وسط تک فلسفۂ تاریخ کے ماہرین اسلامی تہذیب کا ذکر ذرا سرسری انداز میں کرتے ہیں لیکن آگے بڑھتے ہوئے رفتہ رفتہ اسلامی تہذیب کی اہمیت بڑھنے لگتی ہے۔ یورپی نشاۃ ثانیہ کے مطالعے میں گہرائی پیدا ہوتے ہی اسلام کا وہ عہد پیشِ نظر آجاتا ہے جب علمی، عملی اور فکری طور پر تاریخی موثرات اس تہذیب کے کنٹرول میں تھے۔ اسی طرح عرب عنصر کو منہا کر کے یونان کا مطالعہ بھی ممکن نہیں رہتا۔ لیکن اس سے خرابی یہ پیدا ہوتی کہ اسلامی تہذیب کو کم و بیش ان سانچوں میں منحصر کر کے دیکھا جانے لگا، جو یورپ کی تاریخ میں کسی نہ کسی طور پر مؤثر ہوئے ہیں۔ اس طریقۂ کار کا عیب یہ ہے کہ یہاں تہذیب کا تصوّر ہمیشہ فلسفی کی اپنی ذاتی تعریف اور اس کے رجحان سے متعین ہوتا ہے اور عروج و زوال کا معیار مظاہر میں منحصر ہوا کرتا ہے۔ اہم تر سوال یہ ہے کہ تہذیب حقیقت کے ساتھ حرکت اور عروج و زوال کا ایک تصوّر پیش کرتی ہے، جب ایک مرتبہ اس تصوّر کو مسترد کر دیا جائے تو پھر اس تہذیب کو سمجھنے اور اس کے باطن میں اترنے کا کوئی راستہ باقی نہیں رہتا۔

۲۔ اسلامی تہذیب کا تفصیلی مطالعہ کرنے والوں میں مستشرقین کا گروہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس ضمن میں مروّجہ تصوّر کے مطابق اعلیٰ علمی تحقیق کے نمونے اس گروہ کی طرف سے سامنے آئے، مظاہرِ تہذیب اور بنیادی متون کی چھان پھٹک ہوتی اور اسلامی تہذیب سے متعلق ایک بڑا ذخیرہ فراہم ہوا۔ جہاں تک مستشرقین کی تحریروں کے پس منظر میں علمی اور غیر علمی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

محرکات کا تعلق ہے، اس کا تفصیلی جائزہ ایڈورڈ سعید نے اپنی کتاب "اورینٹلزم" ORIENTALISM میں لیا ہے۔ مستشرقین کا منہاج اپنے تمام محرکات اور مؤثرات کے ساتھ علمی بلکہ معلوماتی رہا ہے اور آج بھی ہے۔ ان کے طریقۂ کار کے بارے میں دو طرح کے سوال پیدا ہوتے ہیں:

(ا) کیا تہذیب کی نصب العینی حرکت اور اس کے مقصود سے صرفِ نظر کرکے مظاہر کا مطالعہ اس تہذیب کا کوئی فہم پیدا کر سکتا ہے۔

(ب) کیا تحقیق کے پس منظر میں بین التہذیبی تعلقات کی نوعیت تحقیق کی نہج اور اس کے نتائج کو متاثر کرتی ہے۔

اس طرح کے سوالوں کی روشنی میں اگر اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھا جائے کہ مستشرقین کا مقصود اپنی محکوم اقوام کو سمجھنا، ان کی تاریخ کو نئے سرے سے مرتب کرنا اور اس کے مظاہر کی ترتیب فضیلت کو مغربی نقطۂ نگاہ کے مطابق نئے سرے سے مرتب کرنا تھا، تو یہ امر پوری طرح واضح ہو جاتا ہے کہ اس طریقۂ کار سے سامنے آنے والی تحریروں کی مقدار چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو، ان کے ذریعے اسلامی تہذیب کی روح اور اس کے نظامِ فضیلت تک رسائی حاصل نہیں کی جا سکتی۔

۳۔ مغرب میں تاریخ فلسفہ و علوم پر لکھنے والے اسلامی تہذیب کا مطالعہ ایک خاص جہت سے کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اسلامی تہذیب یونان اور مغرب جدید کے درمیان ایک رابطہ ہے یا تجربی سائنس کے مولد کی حیثیت سے عرب مزاج کی ایک خاص اہمیت ہے۔ چنانچہ وہ مظاہر جو مغربی ذہن کی تشکیل میں کوئی رول رکھتے ہیں، اس گروہ کے نزدیک اہم ہیں اور انہی عناصر کو اسلامی تہذیب کی روح اور اس کا حاصل قرار دیا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک تہذیب کا تصورِ عروج و زوال بھی انہی عناصر کے تابع ہے۔

۴۔ فی زمانہ مشرقِ وسطیٰ اور ایران کی سیاسی صورت حال نے مغرب کی معیشت اور سیاست کو تیزی سے متاثر کیا۔ عرب اسرائیل جنگ کے دوران تیل کا ہتھیار جس طرح استعمال ہوا اور ایران میں انقلاب سے مغربی مفادات جس طرح متاثر ہوئے، اس سارے عمل میں ہر قدم پر مسلم ذہن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے ردِعمل کی بے خطا پیش بینی ممکن نہ ہوسکی۔ اس سے تاثر یہ پیدا ہوا کہ اسلامی تہذیب کے بارے میں موجود مواد اس کے سیاسی اصولِ حرکت اور نظامِ عمل کو سمجھنے میں معاون نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ لازم آیا کہ ایسا نظام وضع کیا جائے جس کے ذریعے مسلم ذہن کے ردِعمل کی بے خطا پیش بینی ممکن ہو۔ اس ضرورت نے مغربی یونیورسٹیوں میں تحقیق کے سانچوں کو بہت حد تک تبدیل کیا ہے پچھلے پانچ سات برسوں میں وہاں ہونے والی تحقیق پر جو مواد شائع ہوا ہے، اس پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تحقیق کا زور اسلامی تہذیب میں ان عناصر پر ہے جو سیاسی طور پر موثر ثابت ہوسکتے ہیں۔ مختلف فرقوں کی نفسیات اور ان کے معتقدات پر تفصیل سے کام ہو رہا ہے۔ قومی نفسیات کے مختلف سانچے بھی اب زیر مطالعہ آنے لگے ہیں۔

ہم نے اجمالاً یہ دیکھ لیا کہ مغرب میں کون سے گروہ اسلامی تہذیب کا مطالعہ کس منہاج سے کرتے ہیں۔ یہ امر بھی واضح ہے کہ یہ سارے منہاج اسلامی تہذیب کی روح تک رسائی حاصل کرنے میں ناکام ہیں اور ان کی کامیابی کا کوئی امکان یوں بھی نہیں ہے کہ یہ سارے طریقہ کار اسلامی تہذیب کی اس روح سے دانستہ بے نیاز رہتے ہیں جو عالمی تہذیبی منظر نامے میں یکتا اور منفرد ہے اور اس کی بنیاد انسان، کائنات اور خدا کے درمیان وہ تعلق ہے جو تاریخ کے سیاق وسباق میں حجیتِ وحی سے متعین ہوتا ہے اور تاریخی قوتوں میں حق اور باطل کی تقسیم کرتا ہے۔

(جاری ہے)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تاریخ و سوانح

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

Dr. Zakir Husain Library • Jamia Nagar • J. M. I. New Delhi

© rasailojaraid.com